Urdu Studies
An international, peer-reviewed,
bilingual research journal
ISSN: 2583-8784 (Online)
Vol. 6 | Issue 1 | Year 2026
Pages: 72-89

اردو ادب میں نو آبادیات کے خلاف مزاحمتی رویے

یاسمین رشیدی

Abstract. Resistance has been a longstanding tradition in Urdu literature, addressing social problems, oppressive customs, gender inequalities, and colonial rule. Urdu writers and poets have consistently raised bold voices against injustice and domination. Focusing on Urdu journalism and poetry, this paper examines selected writers and poets whose works represent significant voices of resistance, highlighting the rich tradition of resistance in Urdu literature.

Keywords. Colonialism, Resistance Literature, Protest, Urdu Poetry, Urdu Journalism, Urdu Literature.

تلخیص: اردو میں مزاحمتی ادب کی روایت بہت قدیم ہے، ہر دور میں اردو ادب میں معاشرے میں پائے جانے والے مسائل کے خلاف مزاحمت نظر آتی ہے۔ جنگ آزادی ہو یا فرسودہ روایات کے خلاف احتجاج، عورت کی تاریک و روشن دنیا کی بات ہو یا معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرنا ہو، اردو ادب کو اس معاملے میں بہت حد تک بیباک کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح نو آبادیات کے خلاف بھی یہاں واضح اور بھرپور آوازیں موجود ہیں۔ اس مقالے میں اردو صحافت اور شاعری، ان دو اصناف کا انتخاب کیا گیا ہے اور ان میں نمایاں رہنے والی چند آوازوں کو شامل کرنے کی کوشش کی گئی ہے

ISSN: 2583-8784 (Online)
Formerly UGC-CARE Listed since October 2021
Published on October 23, 2026
http://www.urdustudies.in
https://creativecommons.org/licenses/by-nc-nd/4.0/?ref=chooser-v1

تاکہ اردو ادب میں مزاحمت کی روایت کا اندازہ لگایا جاسکے۔ چونکہ عنوان میں "ادب" لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس لیے کوشش کی گئی ہے کہ اس لفظ کے استعمال کا کسی حد تک جواز فراہم کیا جاسکے۔ اس مقالے میں چند معروف ادیبوں اور شاعروں پر گفتگو کی گئی ہے جو اردو ادب میں مزاحمت کی نمایاں آواز سمجھے جاتے ہیں۔

کلیدی الفاظ: نو آبادیات، مزاحمتی ادب، احتجاج، اردو شاعری، اردو صحافت، اردو ادب۔

پیش نظر مقالے میں نو آبادیات اور اس کے اثرات کو سمجھنے کے لیے مابعد نو آبادیاتی مطالعے میں مستعمل نظریات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ نو آبادیات کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی اثرات کا مطالعہ، ہندوستانیوں کو ذہنی غلامی سے آزادی اور اپنی تہذیبی جڑوں کی طرف واپسی، یہ تمام پہلو مابعد نو آبادیاتی مطالعہ کی نمایاں خصوصیات میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔ شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ اور ناصر عباس نیر جیسے ناقدین نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے، اس سے بھی اس مقالے میں رہنمائی حاصل کی گئی ہے۔ تجزیے کے ابتدائی مرحلے میں چند اردو ادیبوں کی تحریروں کا مطالعہ کیا گیا، اس کے بعد مقالے کے مرکزی خیالات کو واضح کرنے والے اقتباسات قارئین کے سامنے پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اردو ناقدین کی تحریروں اور مقالہ نگار کے ذاتی مشاہدے کی روشنی میں ایک مختصر مگر جامع تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نو آبادیات اور مابعد نو آبادیات

اردو ادب کے مزاحمتی مزاج پر بات کرنے سے پہلے نو آبادیات اور مابعد نو آبادیات پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ نو آبادیات ہندوستان کی تاریخ کا ایک ایسا سیاہ باب ہے جسے استحصال اور ظلم کا باب کہا جاسکتا ہے۔ اس کے سلسلے میں درج ذیل تعریفیں خاطر خواہ رہنمائی کرتی ہیں:

> Colonialism can be defined as the conquest and control of other people’s land and goods (Césaire 32-33).

> The term colonialism is important in defining the specific form of cultural exploitation that developed with the expansion of Europe over the last 400 years (Ahmad 283).

انگریزوں نے ہندوستانیوں کو صرف سیاسی طور پر ہی غلام نہیں بنایا بلکہ ان کی زبان، ثقافت، رہن سہن، مذہب اور ادب کو بھی کمتر اور "دوجے" (The other) کے طور پر پیش کیا۔ یعنی ہر سطح پر ہندوستانیوں کو خود سے کم تر ثابت کرنے کی کوششیں کیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خصوصیات جو ہندوستانیوں کو انگریزوں سے الگ کرتی تھیں، خامیوں میں تبدیل کر دی گئیں۔ مثلاً جلد کا رنگ، کھانے کا طریقہ وغیرہ، اور ہندوستانی انگریزوں کے "the other" کے طور پر شناخت کیے جانے لگے۔ اس طرف کسی نے غور نہیں کیا کہ کھانے کا طریقہ اس بات پر منحصر ہے کہ ہم کیا کھا رہے ہیں۔ روٹی کھانے کے لیے کانٹے چمچ کا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

نو آبادیات کے اس فریب کا مطالعہ مابعد نو آبادیات (Postcolonialism) کے تحت کیا جاتا ہے۔ اس ڈسکورس میں سیاسی اثرات کے ساتھ ساتھ ان سماجی، ثقافتی اور لسانی اثرات کو بھی سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے جو نو آبادیاتی نظام کی سازش کے طور پر پیدا کیے جاتے ہیں اور چالاکی سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ناصر عباس نیر نے لکھا ہے کہ:

> کولونیل ازم ایک نیا ڈرامہ تھا، جس کا اسکرپٹ یورپ نے لکھا اور جسے کھیلنے کے لیے ایشیا و افریقہ کی سرزمین کو منتخب کیا۔ ڈرامے کے مرکزی کردار یورپی تھے تاہم کچھ معاون اور ضمنی کردار ایشیائی و افریقی تھے۔ مابعد نو آبادیاتی مطالعہ اس ڈرامے اور اس کے کرداروں کے باہمی رشتوں، واقعات، پلاٹ وغیرہ کا تفصیلی تجزیہ کرتا ہے (۲۰۱۳،۶)۔

نو آبادیات کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی اثرات کا مطالعہ، ہندوستانیوں کو ذہنی غلامی سے آزادی دلانا اور اپنی تہذیبی جڑوں کی طرف واپسی، یہ تمام پہلو مابعد نو آبادیاتی مطالعہ کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

Urdu Studies
Vol. 6 | Issue 1 | Year 2026

اردو ادب میں مزاحمت کے عناصر

اردو ادب میں نو آبادیات کے خلاف ابتدا سے ہی مزاحمت نظر آتی ہے۔ نثر ہو یا شاعری، ہر جگہ مزاحمتی آوازیں موجود ہیں۔ اس مزاحمت کی نوعیت ہر جگہ یکساں نہیں ہے۔ کہیں انگریز حکومت اور اس کے جبر کے خلاف صاف اور براہِ راست احتجاج ملتا ہے، کہیں وطن کی محبت، آزادی کی خواہش اور قومی بیداری کے جذبات نمایاں ہیں۔ بعض ادیبوں اور شاعروں نے اپنے عہد کی سیاسی اور معاشی ناانصافیوں کو موضوع بنایا، تو بعض نے تہذیبی زوال، قومی بے حسی اور محکومی کے احساس کو اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ طنز و مزاح، علامت، مرثیہ، شہر آشوب اور قومی شاعری بھی اسی مزاحمتی رویے کی مختلف صورتیں بن کر سامنے آتی ہیں۔ اس لیے اردو ادب میں مزاحمت کو صرف کھلے سیاسی احتجاج تک محدود نہیں کیا جاسکتا، بلکہ شناخت، تہذیب، زبان اور وطن کے تحفظ کا جذبہ بھی اس کا ایک اہم حصہ ہے۔ نو آبادیاتی عہد میں زبان کا مسئلہ محض ذریعۂ اظہار کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ اس کا تعلق اقتدار، تعلیم، ملازمت اور تہذیبی شناخت سے بھی تھا۔ انگریزی زبان کی بڑھتی ہوئی سرکاری اور تعلیمی اہمیت نے ہندوستانی زبانوں کے باہمی رشتوں اور ان کے سماجی مرتبے کو متاثر کیا۔ اردو بھی اس تبدیلی سے الگ نہیں رہی۔ اس صورت حال میں اردو صحافت اور ادب نے ایک طرف عوامی شعور کی تشکیل میں حصہ لیا اور دوسری طرف مقامی زبان، تہذیبی حافظے اور اجتماعی شناخت کے تحفظ کا ذریعہ بنے۔ اس لیے اردو کی مزاحمتی روایت کو صرف انگریز حکومت کے خلاف سیاسی احتجاج کے طور پر نہیں، بلکہ زبان اور ثقافتی خود مختاری کے اظہار کے طور پر بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔

نو آبادیاتی ہندوستان میں اردو ادیبوں نے نہ صرف اپنی تحریروں کے ذریعے انگریزوں اور ان کی پالیسیوں کی مخالفت کی بلکہ آزادی کی لڑائی میں بھی پیش پیش رہے۔ اس حوالے سے اخباروں کی بات کی جائے تو مولوی محمد باقر کا "دہلی اردو اخبار"، ظفر علی خان کا "زمیندار"، مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" اور "البلاغ"، اور مولانا محمد علی جوہر کا "کامریڈ" اور "ہمدرد" جیسے کئی اہم اخبار تھے جو نو آبادیاتی ہندوستان میں انگریز حکومت کے خلاف بے باکی سے لکھ رہے تھے۔ ان ادیبوں کے بغیر اردو صحافت اور مزاحمت کی روایت کو نامکمل کہنا مبالغہ نہ ہو گا۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے

نو آبادیاتی نظام کے خلاف آواز بلند کی، جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اسی وجہ سے انھیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور ان کے اخباروں پر پابندی لگا دی گئی۔

مزاحمت کی پہلی موثر آواز کے طور پر مولوی محمد باقر کا نام اس لیے سب سے زیادہ اہم ہے کہ وہ پہلے صحافی تھے جو ملک کے لیے شہید ہوئے۔ انگریزی حکومت کے خلاف بے باکی سے لکھنے اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں نمایاں کردار ادا کرنے کی وجہ سے انھیں سزائے موت دی گئی۔ ان کے گھر کو آگ لگا دیا گیا، جس میں ان کی لائبریری اور اخبار کی تمام جلدیں، مال و اسباب سب جل کر خاک ہو گئے۔ ان کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد پر بھی حکومت نے قبضہ کر لیا۔ اردو کے پہلے سیاسی صحافی، مولوی محمد باقر "دہلی اردو اخبار" نکالتے تھے۔ اپنے اخبار میں وہ انگریزی حکومت کے سیاسی پروپیگنڈے کو بے نقاب کرتے اور عوام کو ان کی ہر چال سے خبر دار کرتے۔ اس وقت فرقہ واریت کو ہوا دیتی نو آبادیاتی قوتوں کو انھوں نے نہ صرف عوام کے سامنے بے نقاب کیا بلکہ عوام کو متحد رکھنے کے لیے اپنی تحریروں کے ذریعے مسلسل کوشش کرتے رہے۔

مولوی محمد باقر نے اپنے اخبار میں انگریزوں کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ اور ہندوستانیوں کے مذہب تبدیل کرنے کی کوششوں پر بھی سخت تنقید کی۔ اس حوالے سے ۲۹/ مارچ ۱۸۴۱ء کے "دہلی اردو اخبار" میں شائع ہونے والی ایک خبر کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> پادریان انگریزی بہ ترغیب و تحریص پارسیوں کے لڑکوں کو مذہب عیسوی میں لائے ہیں اور ہمیشہ اسی فکر میں رہتے ہیں کہ فرزندوں کو ہر قوم کے اپنے مذہب میں شامل کریں (فراز ۲۳۵)۔

ان کی تحریروں میں انقلابیوں کی کھلی حمایت اور حوصلہ افزائی بھی نمایاں نظر آتی ہے:

> یہ معرکہ تمہارا بھی تواریخوں میں یاد رہے گا کہ کس بہادری اور جواں مردی سے تم نے ایسی اولوالعزم اور متکبر سلطنت کے کبر و غرور کو توڑا ہے اور ان کی نخوت فرعونی اور غرور شدادی کو یکسر خاک میں ملا دیا ہے۔ اور ہندوستان کی سلطنت کو جس پر بڑے بڑے بادشاہوں کا دانت تھا اور ان سے نہ لے سکتے تھے تم نے ان کے

قبضۂ اقتدار سے نکال لیا اور رعایائے ہندوستان کو کہ بلائے بناگہانی میں آگئی تھی اس مصیبت سے نجات دی (فراز ۲۵۴)۔

۱۸۵۷ء کے "دہلی اردو اخبار" کا مطالعہ کیا جائے تو اس پہلی جنگ آزادی میں مولوی محمد باقر اور ان کے اخبار کے فعال کردار کو واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے، اور یہی ان کی شہادت کا سبب بنا۔ ان کے مضامین اور اداریوں میں ان کی بے خوفی نمایاں ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو:

تم گوروں کی روزمرہ کی توپ بازی اور شور و غوغا اور دھوں دھاں سے کچھ اندیشہ نہ کرو۔ یہ چند روز اور چند ساعت کی تکلیف کالوں کی ہے۔ جس کی اجل ہوتی ہے وہی مرتا ہے، بے آئی کو کوئی نہیں جاتا۔ غور کرو کہ اگر آئی ہوتی ہے تو بغیر توپ، گولہ یا بندوق کے کوئی نہیں مر سکتا (فراز ۱۲۸)۔

مولوی محمد باقر نے اپنے دور کے تقریباً ہر اہم سماجی و سیاسی مسئلے کو اپنے اخبار میں پیش کیا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد انگریزوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر ہندو اور مسلمان ساتھ مل کر لڑے تو ان کی حکومت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ اس لیے انھوں نے دونوں کو آپس میں لڑا کر اپنا الّو سیدھا کرنے کی پالیسی اختیار کی۔ مذہب ایک ایسا مدعا ہے جس پر آج بھی خون خرابا کرانا آسان ہے۔ آج کی طرح ہی نو آبادیاتی ہندوستان میں بھی بہت کم لوگ انگریزوں کی اس چالاکی اور مکاری کو سمجھ رہے تھے۔ مولوی محمد باقر کا شمار ان چند اصحاب میں ہوتا ہے جو اس سازش کو بھانپ چکے تھے اور ہندو۔مسلم اتحاد پر زور دیتے ہوئے مسلسل اس پر لکھ رہے تھے، عوام کو اس کی اہمیت بھی بتا رہے تھے:

ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے اپنے مذہبی اختلافات ختم کر دینے چاہئیں کیونکہ جہاں سلطنت کا زوال پاؤ گے وہاں تنازعات مذہبی رعایا کو پاؤ گے (فراز ۱۸۶)۔

اسی طرح انگریز حکومت اور اس کی پالیسیوں کے خلاف لکھنے پر نہ صرف مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبارات پر پابندی عائد کی گئی بلکہ انھیں کئی بار جیل بھی جانا پڑا۔ انھوں نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" اخبار نکالا۔ نو آبادیات اور انگریز حکومت کے خلاف بے باکی سے لکھنے کی وجہ سے انگریزوں

نے ۱۹۱۴ء میں اس پر پابندی عائد کر دی، جس کے بعد انھوں نے "البلاغ" نامی دوسرا اخبار نکالا۔ یہ اخبار بھی "الہلال" کی ہی مانند انگریز حکومت اور اس کے ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرنے میں پیش پیش تھا، جس کی وجہ سے نگریزوں نے اسے بھی پریس ایکٹ کے تحت بند کر دیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اخباروں کے ذریعے انگریزوں کی مخالفت کی، ساتھ ہی ہندو۔ مسلم اتحاد پر بھی زور دیا۔ عرش ملسیانی لکھتے ہیں:

> الہلال نے ہندوستان کی سیاست کے دھارے کو آزادی اور حریت کی طرف موڑا۔ اس نے طبلِ جنگ بجا کر کہا کہ سامراجیت کے پنجے میں گرفتار رہنے کی ندامت سے مر جانا بہتر ہے۔ انہوں نے ببانگِ دہل کہا کہ حق و صداقت کا پیغام ہر مذہب میں ہے۔ اسلام یہ نہیں سکھاتا کہ دوسرے مذاہب والوں سے پُرخاش رکھو۔ غلامی بہت بڑی لعنت ہے، اس کو مل جل کر مٹانا چاہیے۔ اس کا جنازہ جبھی نکلے گا جب ہر ہندوستانی اپنے آپ کو ہندوستانی کہے گا (ملسیانی ۳۴)۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں (جسے ہندوستانیوں کی طرف سے انگریزوں کے خلاف پہلا بڑا مزاحمتی اقدام کہا جا سکتا ہے) اردو صحافت نے نہ صرف فعال کردار ادا کیا بلکہ انگریز حکومت کے خلاف اس تحریک کو پروان چڑھانے میں بھی حصہ لیا۔ ابتدا میں چند اخبارات کا ذکر کیا جا چکا ہے، اس کے علاوہ "صادق الاخبار"، "سید الاخبار"، "سحر سامری"، "طلسم لکھنؤ"، منشی نول کشور کا "اردو اخبار"، کمند لال کا "تاریخ بغاوت آگرہ"، عبدالرحمن کاشف کا اخبار "صبح"، "شمس الاخبار"، "خیر خواہ خلق" اور ایسے کئی اخبار تھے جو انقلاب کی ناکامی کے بعد بھی شائع ہوتے رہے اور اپنے مزاحمتی کردار کی وجہ سے اپنی الگ پہچان بنائی۔

نو آبادیاتی ہندوستان میں اردو صحافت کے بعد شاعری کی جانب توجہ کی جائے تو وہی بے باکی یہاں بھی نظر آتی ہے۔ اردو شاعری میں ہمیشہ سے اپنے دور کی عکاسی نظر آتی ہے، دہلی کی اجڑی ہوئی حالت کا بیان (شہر آشوب) ہو یا ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کے ذریعے قتل ہو رہے ہندوستانیوں کا غم، اس کی تصویریں اردو شاعری میں نمایاں ہیں۔ اس تناظر میں بسمِل عظیم آبادی کی بات کریں تو ع سر

فروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے غزل کے اشعار کس کی زبان پر نہیں ہوں گے، یہ وہ غزل ہے جس کا پہلا شعر پھانسی کے وقت رام پرساد بسمِل کی زبان پر تھا۔ خود رام پرساد بسمِل کی شاعری بھی اسی جذبۂ مزاحمت کی ترجمان ہے: کانگریس پشپانجلی کا یہ حصہ ملاحظہ فرمائیں (خلیق اور حسین ۸۵):

دیش پر قربان ہوتے جاؤ تم اے ہندیوں
زندگی کا راز مضمر خنجرِ قاتل میں ہے
بامِ رفعت پر چڑھا دو دیش پر ہو کر فنا
بسمِل اب اتنی ہوس باقی ہمارے دل میں ہے

یہ وہ شاعری ہے جس پر نو آبادیاتی ہندوستان میں پابندی عائد تھی۔ اسی سلسلے میں برج نارائن چکبست کی نظم "خاکِ ہند" بھی قابلِ ذکر ہے۔ چند اشعار دیکھیے (خلیق اور حسین ۱۹۱):

بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک
ہم بے کسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک
غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

اشفاق اللہ خان اشفاق شہید کاکوروی کی نظم "شورشِ جنوں" کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بھلا جذباتِ الفت بھی کہیں مٹنے سے مٹتے ہیں
عبث ہیں دھمکیاں دار و رسن کی اور زنداں کی
وہ گلشن جو کبھی آزاد تھا گزرے زمانے میں
میں ہوں شاخِ شکستہ یاں اسی اجڑے گلستاں کی
زمیں دشمن زماں دشمن جو اپنے تھے پرائے ہیں
سنو گے داستاں کیا تم مرے حالِ پریشاں کی
یہ جھگڑے اور بکھیڑے میٹ کر آپس میں مل جاؤ
عبث تفریق ہے تم میں یہ ہندو اور مسلماں کی

ایسی نظموں اور غزلوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو نو آبادیاتی دور میں ضبط کر لی گئی تھیں۔ اوپر پیش کی گئی مثالیں اسی سلسلے کی چند جھلکیاں ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے ہندوستانیوں پر جو ظلم و ستم ڈھائے، اردو شاعری اس کے بیان سے پُر ہے۔

بہادر شاہ ظفر، واجد علی شاہ، غالب، داغ، منیر شکوہ آبادی، آغا جو، اقبال، جوش، چکبست، حسرت موہانی وغیرہ نے اردو ادب کے مزاحمتی رویے کو آگے بڑھاتے ہوئے اپنی شاعری میں نو آبادیات کے خلاف آواز بلند کی۔ اقبال کی شاعری میں نو آبادیات کے خلاف احتجاج نمایاں ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم "خضر راہ"، "فرشتوں کا گیت"، "تصویر درد"، "سیاست افرنگ"، "ساقی نامہ" بطور خاص اہم ہیں۔

چکبست کی شاعری میں بھی قومی بیداری اور نو آبادیاتی نظام کے خلاف مزاحمت کا جذبہ نمایاں ہے۔ ان کے یہاں وطن سے محبت محض ایک جذباتی وابستگی نہیں رہتی بلکہ سیاسی حق، آزادیِ اظہار اور قومی خودداری کے احساس سے جڑ جاتی ہے۔ ان کی نظم "وطن کا راگ" میں یہ رویہ خاص طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ شاعر جبر اور زبان بندی کے باوجود اپنے موقف کے اظہار پر اصرار کرتا ہے:

سمجھ لیا کہ ہمیں رنج و درد سہنا ہے
مگر زباں سے کہیں گے وہی جو کہنا ہے
زباں کو بند کیا ہے یہ غافلوں کو ہے ناز
ذرا رگوں میں لہو کا بھی دیکھ لیں انداز
رہے گا جان کے ہمراہ دل کا سوز و گداز
چتا سے آئے گی مرنے کے بعد یہ آواز

ان اشعار میں مزاحمت کا لہجہ محض شکایت تک محدود نہیں بلکہ زبان پر پابندی کے باوجود اظہارِ حق پر قائم رہنے اور کسی رعایت کے بدلے سیاسی حق سے دست بردار نہ ہونے کا جذبہ موجود نظر آتا ہے۔ چکبست کے یہاں اسی قومی احساس کی ایک دوسری صورت وطن کی زبوں حالی پر شدید اضطراب کی شکل میں سامنے آتی ہے۔

چکبست کی نظم ''خاکِ ہند'' میں ہندوستان کی موجودہ حالت کو ایک ایسی تصویر میں پیش کیا گیا ہے جو قومی زوال کے احساس کو بہت شدت سے ظاہر کرتی ہے:

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا
دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا
اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا
گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاکِ وطن کفن کو

''لاش بے کفن'' کی ترکیب محض وطن کی پسماندگی کا بیان نہیں بلکہ اس عہد کی سیاسی اور قومی بے بسی کی ایک مؤثر علامت بھی ہے۔ اس کے باوجود آخری شعر میں وطن سے تعلق ختم نہیں ہوتا بلکہ اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ چکبست کی قومی شاعری کا ایک نمایاں پہلو یہی ہے کہ اس میں وطن کی بدحالی کا احساس، سیاسی آزادی کی خواہش اور قوم کو اس حالت سے نکلنے کی ترغیب ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہوم رول اور قومی آزادی کے ساتھ ہندو مسلم اتحاد بھی اسی وسیع قومی شعور کا حصہ ہے۔

حسرت موہانی کے یہاں مزاحمت کا رنگ قدرے مختلف ہے۔ ان کی شاعری میں نو آبادیاتی جبر کے خلاف احتجاج بعض مقامات پر نہایت واضح اور براہِ راست صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ صرف محکومی کا ماتم نہیں کرتے بلکہ ان اسباب اور طریقوں کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں جن کے ذریعے نو آبادیاتی اقتدار قائم تھا۔ چند اشعار دیکھیے:

رسمِ جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حبِ وطن مستِ خواب دیکھیے کب تک رہے
نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بہ زیرِ نقاب دیکھیے کب تک رہے
دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھیے کب تک رہے

ان اشعار میں حسرت کے احتجاج کے کئی پہلو ایک ساتھ سامنے آتے ہیں۔ ایک طرف وہ قوم کی خوابیدگی کو سوالیہ انداز میں دیکھتے ہیں، دوسری طرف "قانون" کے نام پر ہونے والے جبر سے پردہ اٹھاتے ہیں، اور پھر ہندوستان کی دولت پر اغیار کے قبضے کو موضوع بناتے ہیں۔ اس طرح ان کا احتجاج صرف سیاسی محکومی تک محدود نہیں رہتا بلکہ نو آبادیاتی قانون اور معاشی استحصال بھی اس کی زد میں آتے ہیں۔ خاص طور پر "جبر بہ زیرِ نقاب" کی ترکیب اس نظام کی اس صورت کو ظاہر کرتی ہے جس میں ظلم اپنی ظاہری شکل بدل کر قانون اور نظم و نسق کا نام اختیار کر لیتا ہے۔

حسرت کے کلام میں آزادی اور غلامی کا مسئلہ بھی بار بار سامنے آتا ہے۔ قومی رہنما بال گنگا دھر تلک کے بارے میں ان کے اشعار میں یہ جذبہ اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے:

اے تلک اے افتخارِ جذبۂ حبِ وطن
حق شناس و حق پسند و حق یقین و حق سخن
تجھ سے قائم ہے بنا آزادی بیباک کی
تجھ سے روشن اہلِ اخلاص و صفا کی انجمن
سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزندِ ہند
خدمتِ ہندوستاں میں کلفتِ قید محن
ذات تیری رہنمائے راہِ آزادی ہوئی
تھے گرفتارِ غلامی ورنہ یارانِ وطن

یہاں "راہِ آزادی" اور "گرفتارِ غلامی" جیسی ترکیبیں کسی مجازی مفہوم کی محتاج نہیں رہتیں بلکہ براہِ راست سیاسی مفہوم اختیار کر لیتی ہیں۔ قومی رہنما کی تعریف بھی اسی بنا پر کی جاتی ہے کہ اس نے آزادی کی راہ دکھائی اور قید و بند برداشت کیا۔ اس طرح حسرت کے یہاں شخصی مدح بھی قومی آزادی کے تصور سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ حسرت کی مزاحمتی شاعری کا ایک قابلِ توجہ پہلو یہ بھی ہے کہ ان کے باغیانہ جذبات غزل کی مانوس اور تہذیب یافتہ فضا سے الگ نہیں ہوتے۔ جس شعری فضا میں عشق، وفا، قید، بے قراری اور وارفتگی کے مضامین بیان ہوتے تھے، حسرت اسی زبان میں وطن، آزادی، غلامی اور

سامراجی جبر کے تجربے کو بھی جگہ دیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی مزاحمتی شاعری میں سیاسی احتجاج کے باوجود غزل کا آہنگ برقرار رہتا ہے۔ گوپی چند نارنگ (۲۸۶) نے اس پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> حسرت نے نہ صرف عاشقانہ شاعری میں تہذیب عاشقی کو زندہ کیا بلکہ باغیانہ شاعری کو بھی تہذیب عاشقی کے آداب سے روشناس کرایا اور غزل کی فضا میں بھر پور طور پر غیر ملکی سامراج کے خلاف آواز اٹھائی۔

شاعروں کی اس فہرست میں اکبر الہ آبادی کا ذکر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اکبر اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے لیے مشہور ہیں۔ ان کا دور نو آبادیاتی دور ہے۔ اسی اثر کے تحت ان کی شاعری روایتی شاعری سے ہٹ کر مزاحمتی رنگ میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ یہ مزاحمت طنز و مزاح اور علامتوں کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے، لیکن اس سے شاعری کی اہمیت کم ہوتی ہے اور نہ مزاحمت کی شدت۔ اس حوالے سے محمد حسن عسکری کا بیان (۹۳۷) ملاحظہ ہو: "یہ ساری چیزیں جن پر اکبر طنز کرتا ہے سماجی اور ثقافتی اقدار کے اس انقلاب کی علامتیں ہیں جو انگریزوں کے اقتدار کی وجہ سے ہندوستان میں رونما ہوا۔" ان کا خیال ہے کہ اکبر نے اپنی شاعری میں انگریزی حکومت سے متعلق اشیا جیسے ریل، انجن، موٹر، کمپ، بریگیڈ وغیرہ کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔ دراصل یہ ہندوستان کی ترقی کے نام پر نو آبادیاتی نظام اور غلامی کی نمائندگی کرتے ہیں، اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے تسلط اور اثر و رسوخ کی علامت ہیں۔ "کمپ" ان کی شاعری میں مغربی معاشرت کی علامت ہے، جبکہ "بریگیڈ" ان ہندوستانیوں کی نمائندگی کرتا ہے جو ظاہری طور پر تو ہندوستانی تھے مگر ذہنی طور پر انگریز بن چکے تھے۔ اکبر نے اپنی شاعری میں کھل کر اس کی مخالفت کی ہے۔

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے
آگے انجن کے دین ہے کیا چیز
بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز

شمس الرحمن فاروقی (۲۰۱۰، ۱۸۵) نے واضح کیا ہے کہ ان اشعار میں "انجن" نوآبادیاتی سامراجی طاقت کی بے امتیاز قوت کا استعارہ ہے، اور "دین" مشرقی روحانیت کا استعارہ ہے۔ محمد حسن عسکری (۹۳۲) نے انجن کو ایک پورے معاشرتی اور سیاسی عمل کا نمائندہ کہا ہے۔

کہتے ہیں راہِ ترقی میں ہمارے نوجوان
خضر کی حاجت نہیں ہم کو جہاں تک ریل ہے
برق کے لیمپ سے آنکھوں کو بچائے اللہ
روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

ہم سب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہندوستان میں ریل ہندوستان کی ترقی کے لیے نہیں چلائی گئی تھی بلکہ انگریزوں کا مقصد ان اندرونی علاقوں تک رسائی حاصل کرنا تھا جہاں پہلے ان کی پہنچ نہیں تھی، تاکہ زیادہ سے زیادہ خام مال حاصل کیا جاسکے۔ برطانوی صنعتی انقلاب میں ہندوستانی سرمایے کا کیا کردار رہا، یہ بات تاریخی کتابوں میں بہ آسانی دیکھی جاسکتی ہے۔ نوآبادیاتی جدیدیت کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ ترقی کے نام پر متعارف کرائے جانے والے ادارے اور ذرائع نقل و حمل استعماری مفادات سے بھی وابستہ تھے۔ ہندوستان میں ریلوے کی توسیع نے آمدورفت اور تجارتی رابطوں کو وسعت دی، لیکن اس کا تعلق خام مال کی ترسیل، برطانوی تجارت اور نوآبادیاتی انتظامی و عسکری ضروریات سے بھی تھا۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری میں انجن، ریل اور مغربی طرزِ معاشرت سے متعلق طنز کو اسی تاریخی تضاد کے تناظر میں سمجھا جاسکتا ہے۔ ان کی تنقید کا بنیادی ہدف محض نئی ایجادات نہیں، بلکہ ترقی کے اس یک طرفہ تصور پر سوال اٹھانا ہے جس میں مقامی معاشرت اور تہذیبی خودمختاری کی قیمت پر مغربی نمونوں کی تقلید کو ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔

اکبر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ جدید تعلیم کے مخالف تھے، لیکن درحقیقت وہ نوآبادیاتی نظام کے پس پردہ چھپی حقیقت کو سمجھ رہے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

طفل میں بو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

کوٹ اور پتلون جب پہنا تو مسٹر بن گیا
جب کوئی تقریر کی جلسے میں لیڈر بن گیا

اکبر جدید تعلیم کے نہیں، اس تعلیم کے خلاف تھے جو ہندوستانیوں کو محض کلرک بنانے تک محدود تھی، جو مغربی تہذیب کو ہی اصل تہذیب سمجھتی تھی۔ یہ تعلیم ایک ایسا طبقہ پیدا کر رہی تھی جو بظاہر ہندوستانی مگر ذہنی طور پر انگریز تھے، اور اپنے ہی ہندوستانی بھائی بہنوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے:

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو ان پر ہے جو اس مٹنے پہ مرتے ہیں
میری نصیحتوں کو سن کر وہ شوخ بولا
نیٹو کی کیا سند ہے صاحب کہیں تو مانوں

"نیٹو"اور "صاحب" کے درمیان کا دوجاپن (otherness) اور اس کی نفسیات کو اکبر نے اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

علوم ان کے زباں ان کی پریس ان کے لغات ان کے
ہماری زندگی کے سارے اجزا پر ہیں ہاتھ ان کے

ناصر عباس نیر نے لکھا ہے کہ "نیٹو" نسل پرستانہ اصطلاح ہے، نہ صرف اپنے عمومی استعمال میں بلکہ اپنے لغوی معانی میں بھی نسل پرستانہ تلازمات کی حامل ہے۔ اکبر کے حوالے سے اس کی توضیح میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> نیٹو صرف مقامی شخص نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو اپنی ہی زمین پر، اپنے ہی لوگوں، اور خود اپنی ذات کے آگے سند و اعتبار سے محروم ہو گیا ہے۔ سند، اب صرف صاحب یعنی گورے کی ہے۔ نیٹو کی ذات، شناخت اور اس کے نجی رشتوں کے لیے صاحب ہی کا کہا سند ہے۔ اکبر نے شوخی سے ضرور کام لیا ہے، مگر یہ انیسویں صدی کے ہندوستانیوں کا عام تجربہ تھا کہ بڑے سیاسی، تعلیمی مسائل سے

> لے کر نجی رشتوں تک، نیٹو غیر معتبر ہو گیا تھا۔ اس کا درجہ ایک ایسے وحشی، نیم مہذب یا بچے کی مانند تھا جسے یقین دلا دیا گیا ہو کہ اس کے ماضی میں جو کچھ ہے، اس پر صرف ندامت ہی ظاہر کی جاسکتی ہے، اور وہ اپنے حال کو بہتر بنانے، اپنے سیاسی و تعلیمی نظام، اور اپنے ادب و آرٹ کے اخلاقی و جمالیات معیارات کا فیصلہ کرنے کی اہلیت سے محروم ہے۔ اس کی بقا گورے صاحب پر مسلسل انحصار میں ہے(۲۰۲۳، ۱۰)۔

لہذا، ہمیں یہ باور کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ اکبر بخوبی سمجھتے تھے کہ انگریز ہندوستانی ذہن کو مفلوج بنا رہے تھے۔ جدید تعلیم اور تہذیب کے نام پر جو کچھ پیش کیا جا رہا تھا، اس کا تعلق دراصل صرف اور صرف انگریزوں کے ذاتی مفاد سے تھا۔ اکبر اپنی شاعری میں مغربی تہذیب سے بے زار نظر آتے ہیں، اس پر تنقید کرتے ہیں اور اپنے تہذیب و تمدن، ثقافتی جڑوں کی طرف واپسی چاہتے ہیں۔ یہ بصیرت، یہ شعور——جو نوآبادیاتی ہندوستان میں عام طور پر مفقود تھا——اکبر میں نمایاں نظر آتا ہے۔ جس کی مثالیں ان کی شاعری میں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو کے مشہور ناقد محمد حسن عسکری اکبر کو "اردو کا جدید ترین شاعر" کہتے ہیں۔

> مغرب سے جو چیزیں(ان میں خیالات اور تصورات کو بھی شامل سمجھیے)مشرق میں آئی ہیں، مشرق کی زندگی سے ان کے تصادم اور ان کے اثر کا بیان اکبر نے صرف ہندوستان کے نقطہ نظر سے نہیں کیا بلکہ پورے ایشیا کی طرف سے ان چیزوں کے معنی مقرر کئے ہیں اور یہ کام انھوں نے "ایشیا کی آزادی کا اعلان نامہ" لکھ کر انجام نہیں دیا بلکہ صرف اپنی شعری تکنیک کے ذریعے۔ (عسکری ۹۳۱)

اکبر ایسے شاعر کی حیثیت رکھتے ہیں جو بدلتی ہوئی قدروں پر گہری نظر رکھتے تھے اور ان تبدیلیوں کی آہٹ کو بھی سن رہے تھے جو آنے والے وقت میں ہندوستان کی تصویر بدلنے والا تھا۔ اکبر نوآبادیاتی سیاست اور اس کے منفی اثرات کو بخوبی سمجھتے تھے اور ان کا اظہار اپنی شاعری میں کھل کر کرتے رہے۔

جب وہ عدالتی خدمات میں تھے، اس وقت بھی ان کی شاعری میں اقتدار کے خلاف مزاحمتی لہجہ واضح تھا:

نیٹو نہیں ہو سکتے جو گورے تو ہے کیا غم
گورے بھی تو بندے سے خدا ہو نہیں سکتے

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

اکبر نے انگریزوں کی حکومت اور مغربی تہذیب دونوں کے منفی اثرات کو بہت پہلے سمجھ لیا تھا، جب کہ اس دور میں اکثر لوگ نو آبادیاتی فریب کا شکار ہو رہے تھے۔ اس پس منظر میں جب ہم اکبر کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کی مزاحمت سطحی محسوس نہیں ہوتی (جیسا کہ باور کرایا جاتا ہے) بلکہ ایک گہرے فکری شعور اور مشرقی قدروں کی عکاس نظر آتی ہے۔۔ شمس الرحمن فاروقی اکبر کو اس معاملے میں شرف اولیت عطا کرتے ہیں کہ انھوں نے نو آبادیات کی حقیقت کو بہت پہلے سمجھ لیا تھا۔

> مغربی تہذیب کے لیے اکبر نے بعض الفاظ وضع کیے مثلاً "برگیڈ" (Brigade)، کمپ (Camp)، توپ، انجن، وغیرہ جو علامت کا حکم رکھتے ہیں اور جن کی کارفرمائی ہم آج بھی دیکھ سکتے ہے۔ برگیڈ سے ان کی مراد وہ ہندوستانی تھے جو انگریزوں کے وفادار تھے اور کمپ سے ان کی مراد مغربی معاشرت تھی۔ توپ، استعماری قوت کے اظہار، اور انجن اس قوت کو پھیلانے والے ذرائع کا استعارہ ہیں (۱۸۲)۔

اکبر کی شاعری میں نو آبادیات اور مغربی تہذیب پر جو طنز ملتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی شاعری ہمارے زمانے کی سچائی ہے اور کئی زمانوں کی ہم عصر تاریخ بھی اس میں بولتی نظر آتی ہے۔ نو آبادیات نے ہندوستان کی ثقافتی وراثت کو جو ٹھیس پہنچائی، ہم آج بھی اس سے نبرد آزما ہیں اور تاریخی پس منظر بدل جانے کے بعد بھی ان کے اشعار بامعنی ہیں۔

اردو ادب کی مزاحمتی روایت کا جائزہ لینے سے واقفیت ہوتی ہے کہ نو آبادیاتی اقتدار کے خلاف احتجاج نے مختلف ادیبوں کے یہاں مختلف صورتیں اختیار کیں۔ مولوی محمد باقر کی صحافت میں یہ

مزاحمت سیاسی بے باکی، عوامی بیداری اور قومی اتحاد کے اظہار کے طور پر سامنے آتی ہے، جب کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں صحافت قومی آزادی اور فکری خود مختاری کی تحریک سے وابستہ نظر آتی ہے۔ حسرت موہانی اور برج نارائن چکبست کی شاعری میں آزادی، وطن دوستی اور سیاسی خودداری کے جذبات نمایاں ہیں، جب کہ اکبر الہ آبادی نے طنز و مزاح کے ذریعے نو آبادیاتی جدیدیت، ذہنی مرعوبیت اور تہذیبی بیگانگی کو موضوع بنایا۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ مزاحمت کسی ایک اسلوب یا صنف تک محدود نہیں تھی، بلکہ اپنے عہد کے سیاسی اور ثقافتی مسائل کے مطابق اس کی شکلیں بدلتی رہیں۔ یہی تنوع اردو ادب کی مزاحمتی روایت کی بنیادی قوت ہے۔

اردو ادب میں مزاحمت کی روایت نہایت قدیم اور مضبوط ہے، جس میں نو آبادیاتی قوتوں کے خلاف واضح آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اس مقالے میں خاص طور پر اردو صحافت اور شاعری پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ مولوی محمد باقر اور اکبر الہ آبادی جیسے ادیبوں کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے اپنی تحریروں اور خیالات کے ذریعے نو آبادیاتی طاقتوں کا بھرپور مقابلہ کیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اردو صحافت نے نہایت اہم کردار ادا کیا۔ مولوی محمد باقر کے "دہلی اردو اخبار" جیسے اخبارات نے عوام کو بیدار کیا اور انگریز حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کی۔ اسی طرح اردو شاعری میں بھی مزاحمت کے اثرات نمایاں نظر آتے ہیں۔ بسمل عظیم آبادی کی "سرفروشی کی تمنا" اور اکبر الہ آبادی کی طنزیہ شاعری نے نو آبادیاتی نظام کو چیلنج کیا۔ یہ مقالہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ اردو ادب نے نہ صرف ادبی سطح پر بلکہ سماجی اور ثقافتی سطح پر بھی نو آبادیات کے خلاف بھرپور مزاحمت کی۔

مراجع:

احمد، رضوان۔ (مرتب)۔ روح چکبست۔ الہ آباد: رام نرائن لال ارن کمار۔ ۱۹۸۸۔

الہ آبادی، اکبر۔ کلیات اکبر الہ آبادی۔ دہلی: میڈیا انٹرنیشنل۔ ۱۹۹۸۔

انجم، خلیق، و مجتبیٰ حسین۔ (مرتبین)۔ ضبط شدہ نظمیں۔ نئی دہلی: مجلس جشن علی جواد زیدی۔ ۱۹۷۵۔

عسکری، محمد حسن۔ مجموعہ حسن عسکری۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔ ۲۰۰۸۔

فاروقی، شمس الرحمن۔ ”اکبر الہ آبادی: نو آبادیاتی نظام اور عہدِ حاضر“۔ مشمولہ۔ صورت و معنی سخن۔ نئی دہلی: ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز۔ ۲۰۱۰۔ ص ۱۹۴-۱۸۱۔

فراز، عادل۔ اردو صحافت اور مولوی محمد باقر دہلوی۔ دہلی: عرشیہ پبلی کیشنز۔ ۲۰۱۹۔

ملسیانی، عرش۔ ابو الکلام آزاد۔ نئی دہلی: پبلی کیشنز ڈویژن۔ ۱۹۷۴۔

نارنگ، گوپی چند۔ کاغذ آتش زدہ۔ دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔ ۲۰۱۱۔

نیّر، ناصر عباس۔ مابعد نو آبادیات: اردو کے تناظر میں۔ کراچی: اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس۔ ۲۰۱۳۔

ــــــ۔ ”بیٹوِ کی کیا سند ہے صاحب کہیں تو مانوں“۔ مشمولہ اردو اسٹڈیز، ۲۰۲۳۔ ص ۴۵-۹۔ https://urdustudies.in/urdu-studies-vol-3-issue-1-october-2023-/10

Ahmad, Aijaz. "The Politics of Literary Postcoloniality." In *Contemporary Postcolonial Theory*,edited by Padmini Mongia, Oxford University Press. 1997.

Césaire, Aimé. *Discourse on Colonialism*.Translated by Joan Pinkham, Monthly Review Press. 2000.

Dr. Yasmeen Rasheedi is an Assistant Professor and Head of the Department of Urdu at T. P. College, B. N. Mandal University, Madhepura, Bihar. She earned her M.A., M.Phil., and Ph.D. from Jawaharlal Nehru University, New Delhi, and received the Sajjad Zaheer and Razia Sajjad Zaheer Merit Award for securing the highest CGPA in her M.A. programme. She has qualified for UGC-NET and received the JRF and SRF. Her research articles, essays, and reviews have appeared in journals including *Urdu Adab, Urdu Duniya, Fikr-o-Tahqeeq, Adab-o-Saqafat, Tasteer, Isbaat,* and *Andaaz-e-Bayaan.*